سورۃ نوحؑ

مکی سورۃ ہے اس میں ۲۸ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(۱) **اِنَّآ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا** (ترجمہ:۔ بے شک ہم نے نوحؑ کو بھیجا) کہا جاتا ہے کہ وہ ابن لامک بن متوشلخ بن اخنوع بن قینان بن شیث بن آدمؑ ہیں۔ ابوحیان نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ وہ ابن لامک بن متوشلخ بن اخنوع اور وہ ادریس بن مبرد مہیلا کیل بن انوش بن قینان بن شیث بن آدمؑ ہیں۔ اور اس میں بہت اختلاف ہے۔ اور اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نسابون (اہل نسب) نے عدنان کے بعد مغالطہ کیا ہے اس کا ذکر پہلے کر دیا ہے۔ اور نوحؑ پہلے نبی ہیں جنہیں ان کی قوم کی طرف بھیجا گیا۔ اور انہیں شیخ الانبیاء والمرسلین کہا جاتا ہے۔ **اِلٰی قَوۡمِہٖۤ** (ترجمہ:۔ ان کی قوم کی طرف) اور وہ سرکشی میں شدید کفر وعناد میں بہت زیادہ بڑھے ہوئے تھے مشرک اقوام میں سے۔ بتوں کو پوجتے تھے اور انہیں پکارتے تھے پس اللہ نے نوحؑ کو وحی فرمائی اور حکم دیا کہ **اَنۡ اَنۡذِرۡ قَوۡمَکَ** (ترجمہ:۔ کہ اپنی قوم کو ڈراؤ) ان مفسرہ ہے کیونکہ ارسال میں قول کے معنی ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان مصدریہ ہے۔ یعنی بان انذر قومک۔ ابن مسعودؓ نے اسے ان کے بغیر "انذر قومک" پڑھا ہے۔ **مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ** (ترجمہ:۔ اس سے پہلے کہ ان پر دردناک عذاب آئے) یعنی ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا کہ اپنی قوم کو امر ونہی کے ذریعہ ڈراؤ قبل اس کے کہ ان پر عذاب نازل ہو پھر ان کے لئے عذر باقی نہیں رہے گا۔ پھر نوحؑ نے ان سے کہا۔

(۲) **قَالَ یٰقَوۡمِ اِنِّیۡ لَکُمۡ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ** (ترجمہ:۔ اے میری قوم کے لوگو میں تمہارے لئے واضح ڈرسنانے والا ہوں) یعنی حقیقت امر کی وضاحت کرنے والا اور اللہ کے عذاب سے ڈرانے والا ہوں یا اس چیز کو کھول کر بیان کرنے والا ہوں۔ جس میں تمہاری نجات کا سامان ہے۔

(۳) **اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ** (ترجمہ:۔ کہ اللہ کی عبادت کرو) ان مفسرہ ہے جیسا کہ زجاج کا نقطہ نظر ہے اور دوسروں کے نزدیک مصدریہ ہے۔ اور پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔ یعنی نوحؑ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک عبادت نہ کرو۔ **وَاتَّقُوۡہُ** (ترجمہ:۔ اور اس سے ڈرو) یعنی اس چیز سے احتراز کرو جو تم پر اللہ کے عذاب کو نازل کرے گی وہ ہے اس کی عبادت میں دوسرے کو شریک کرنا۔ **وَاَطِیۡعُوۡنِ** (ترجمہ:۔ اور میری اطاعت کرو) ان تمام امور میں جن کے بارے میں میری طرف وحی کی جاتی ہے او امر ونواہی وغیرہ سے۔ کیونکہ اللہ نے مجھے تمہاری طرف بھیجا ہے تاکہ تمہاری صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کروں۔

(۴) **یَغۡفِرۡ لَکُمۡ مِّنۡ ذُنُوۡبِکُمۡ** (ترجمہ:۔ وہ تمہارے گناہوں سے درگذر فرمائے گا) اصل میں ہے یغفر لکم ذنو بکم اور من کو یہاں پر بعض کے معنی کے لئے اضافہ کیا گیا ہے۔ یعنی تمہارے بعض گناہوں کو معاف کر دے گا۔ اور وہ ہیں جو کفر

وشرک کے عالم میں اس سے پہلے گذر چکے ہیں کیونکہ ایمان اپنے سے پہلے کے تمام اعمال کو منہدم کر دیتا ہے۔ **وَيُؤَخِّرْكُمْ** (ترجمہ:۔وہ تمہیں مہلت دے گا) موت سے اور زجاج نے کہا ہے کہ تمہیں عذاب سے مہلت دے گا پھر تم ایسی موت مروگے جو جڑ سے اکھاڑنے والے عذاب کے ذریعہ نہیں ہوگی۔ **اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى** (ترجمہ:۔مقرر مدت تک) یعنی اس وقت تک جسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ تمہارے کفر کی وجہ سے فوراً مواخذہ نہیں فرمائے گا۔ اور نہ ہی تمہارے گناہوں کی وجہ سے موت دے گا۔ بلکہ اس وقت تک تمہیں موخر کر دے گا جو اس کے علم ازلی میں متعین ہے۔ **اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ** (ترجمہ:۔اللہ کا مقرر کردہ وقت) یعنی جسے اس نے اپنے علم میں مقدر کر رکھا ہے۔ **اِذَا جَآءَ** (ترجمہ:۔جب آ جائے) اور اس وقت تم کفر وشرک پر ہو۔ **لَا يُؤَخَّرُ** (ترجمہ:۔تو ٹالا نہیں جائے گا) بلکہ اس کا واقع ہونا ضروری ہے۔ پس موت کی علامات سے پہلے توبہ کرو اللہ اس کے رسول کی اطاعت کی طرف جلدی کرو۔ یہاں اجل کو اللہ کی طرف اضافت کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ وہ اس کا فاعل و آمر ہے۔ اور کبھی کبھار ''اجل'' اس چیز کی طرف بھی اضافت کی جاتی ہے جس پر واقع ہو رہی ہو۔ جیسے اللہ فرماتا ہے۔ اذا جاء اجلهم فلا يستاخرون ساعة و لا يستقدمون (یونس آیت ۴۹) کیونکہ اللہ کے ارادہ میں خلاف ورزی کا وقوع محال ہے۔ **لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ** (ترجمہ:۔کاش تم جانتے) کچھ بھی علم میں سے تو یقیناً تم ہوتے یا تم میرے حکم کی طرف متوجہ ہوتے (مطیع ہوتے)

(۵) **قَالَ** (ترجمہ:۔عرض کیا) نوحؑ نے **رَبِّ اِنِّيْ دَعَوْتُ قَوْمِيْ لَيْلًا وَّنَهَارًا** (ترجمہ:۔اے میرے رب بیشک میں نے اپنی قوم کو رات دن دعوت دی) ہدایت کی طرف بغیر کسی انقطاع کے شب و روز۔

(۶) **فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِيْٓ** (ترجمہ:۔میرے دعوتِ حق نے ان کے لئے زیادہ نہ کیا) ان میں کسی چیز کو **اِلَّا فِرَارًا** (ترجمہ:۔سوائے فرار کے) مقاتل کہتے ہیں یعنی ایمان سے بھاگنا۔ گویا کہ وہ بدکنے والے گدھے ہوں جو شیر سے بھاگتے ہوں۔ یہاں لفظ فرار نفرت سے مجاز ہے۔ مسبب کو ذکر سبب مراد لیا گیا ہے۔ اور یہ مجاز مرسل ہے اور زیادتی کی دعا سے نسبت اس لئے ہے کہ وہ اس کا سبب تھی۔ اور یہ اس لئے کہ کبھی کبھار ایک امر متضاد امور کا سبب بنتا ہے۔ جیسے بارد ور اطب ہوا نافع ہوتی ہے مدقوق کو اور ٹھنڈ کے بخار والے کے لئے نقصان دہ ہے۔ اور وہ پانی جو نباتات کو نمو دیتا ہے وہ پھلوں میں مٹھاس کا اضافہ کرتا ہے اور بچھو کے ڈنک میں زہر کا اضافہ کرتا ہے اسی طرح مشک ہے کہ اس کا سونگھنا مرطوب مزاج کے لئے مفید ہے۔ اور مزاج حار کے لئے مضر ہے۔ کسی شاعر نے اس طرف یوں اشارہ کیا ہے۔

و ماء المزن فی الاصداف در و فی فم الافاعی صار سمّا

(برسات کا پانی صدوف میں موتی اور کالے ناگوں کے منہ میں زہر بنتا ہے) اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی دعا بھی دو متضاد امور کا سبب ہوتی ہے یعنی ہدایت اور گمراہی۔ پس وہ بعض کے حق میں حصول ہدایت کا سبب ہوتی ہے اور بعض کے حق میں حصول گمراہی کا۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ ہدایت و گمراہی کا مستقل سبب اللہ کی مشیت ہے۔ اسی لئے فرمایا یضل به کثیرا و یهدی به کثیراً . جمهور

نے دعا ی کو ''یا کی زبر کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے ''یا'' کے سکون سے بھی پڑھا گیا ہے۔اور یہاں استثناء مفرغ ہے۔

(۷) **وَاِنِّیۡ کُلَّمَا دَعَوۡتُهُمۡ** (ترجمہ:۔اور میں نے جب بھی انہیں بلایا) مغفرت کے سبب کی طرف اور وہ ہے تیری ذات پر ایمان لانا۔ **لِتَغۡفِرَ لَهُمۡ** (ترجمہ:۔کہ تو انہیں بخش دے) ان کے ایمان اور ان کی طاعت کی وجہ سے۔ **جَعَلُوۡۤا اَصَابِعَهُمۡ فِیۡۤ اٰذَانِهِمۡ** (ترجمہ:۔انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھوس لیں) تا کہ داعی الی اللہ کی آواز نہ سنیں۔اور یہ ان کی نفرت اور کفر پر اصرار کی وجہ سے تھا۔**وَاسۡتَغۡشَوۡا ثِيَابَهُمۡ** (ترجمہ:۔اور انہوں نے اپنے کپڑے لپیٹ لئے) یعنی کپڑوں کے ساتھ اپنے چہرے کو ڈھانپ لیا تا کہ مجھے نظر نہ آئیں۔اور ابن عباسؓ فرماتے ہیں تا کہ وہ بھیس بدل لیں اور وہ انہیں پہچان نہ سکیں۔ **وَاَصَرُّوۡا** (ترجمہ:۔اور انہوں نے اصرار کیا) کفر و گمراہی پر **وَاسۡتَكۡبَرُوا** (ترجمہ:۔اور تکبر کیا) قبول حق سے۔ **اسۡتِكۡبَارًا** (ترجمہ:۔شدید قسم کا تکبر) حد درجہ

(۸) **ثُمَّ اِنِّیۡ دَعَوۡتُهُمۡ جِهَارًا** (ترجمہ:۔میں نے انہیں بلند آواز سے پکارا) یعنی بلند آواز سے انہیں بلایا۔ **جاهرهم بالامر مجاهرة و جهارا** کے معنی ہیں انہیں اعلانیہ بلایا۔اور کہا جاتا ہے **جاهرني فلان**' فلاں نے اعلانیہ طور پر بلایا اور حدیث شریف میں ہے **کل امتی معافی الا المجاهرين** یعنی میرے ہر امتی کے لئے معافی ہے سوائے اعلانیہ طور والوں کے۔آپ ﷺ نے فرمایا یہ وہ لوگ جو اعلانیہ گناہ کرتے ہیں اور انہیں ظاہر کرتے ہیں۔اور جو اللہ نے ان کی ستر پوشی فرمائی ہے اسے وہ کھول دیتے ہیں پھر اس کا ڈنکا پیٹتے ہیں۔

(۹) **ثُمَّ اِنِّیۡۤ اَعۡلَنۡتُ لَهُمۡ وَ اَسۡرَرۡتُ لَهُمۡ اِسۡرَارًا** (ترجمہ:۔پھر میں نے اعلانیہ انہیں دعوت دی اور پوشیدہ طور پر بہت کچھ سمجھایا) اعلان جہاد سے زیادہ شدید ہے۔اور اس سے مراد ہے تمام لوگوں کے درمیان دعوت کا مشتہر کرنا اور زمین کے چپے چپے میں مشہور کرنا اور اسرار جہاد سے کم ہے۔معنی یہ ہیں کہ میں نے انہیں کبھی ان کی مجالس میں بلند آواز سے دعوت دی اور ہدایت کی طرف ان کی رہنمائی کی پھر انہیں اعلان کے طور پر بھی دعوت دی۔اور انہیں بلانے میں مبالغہ سے کام لیا۔اور میں نے اسرار و اعلان دونوں کو جمع کیا اور اعلان جہاد اسرار سے زیادہ سخت ہے۔یعنی انفرادی طور پر کھسر پھسر یا بلند آواز سے بلانے سے کہیں زیادہ۔یہاں لفظ **ثم** کو لایا گیا ہے اس لئے کہ بعض قسم کے بلاوے بعض قسم کی دعوتوں کے بعد تھے۔یا مختلف قسم کے بلاووں میں زمانے کے فرق کی وجہ سے ''ثم'' کو لایا گیا۔اور جهاراً مصدر کی وجہ سے منصوب ہے۔یعنی **دعوتهم دعاء جهاراً** یا اس کے معنی ہیں میں نے انہیں بلایا اور انہیں بلند آواز سے پکارا۔یا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

(۱۰) **فَقُلۡتُ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا** (ترجمہ:۔تو میں نے کہا بخشش مانگو اپنے رب سے بیشک وہ بہت بخشنے والا ہے) یعنی اپنے رب سے شرک و گناہ کی معافی مانگو اور اس کی اطاعت کرو وہ تمہیں معاف فرمائے گا۔کیونکہ وہ غفار ہے۔اس کے بعد اللہ نے اپنی توحید پر استدلال فرمایا ہے۔پہلا استدلال یوں ارشاد فرمایا۔

(۱۱) يُرْسِلِ السَّمَآءَ (ترجمہ:۔بھیجے گا بارش کو یعنی بادل کو) زجاج نے کہا لغت میں ہر اونچی اور بلند چیز کو سما یسمو کہا جاتا ہے اور ہر چھت "سماء" ہے اسی وجہ سے سحاب کو سماء کہا گیا ہے کیونکہ وہ بلند ہے۔ جو بھی تمہارے سر کے اوپر ہے وہ آسمان ہے۔ ارسل کے معنی ہیں اس نے کھول دیا اور ڈھیلا کر دیا۔ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا (ترجمہ:۔تم پر زوردار) یعنی زوردار بارش برسائے گا۔ معنی یہ ہیں کہ تم پر بادل کو کھولے گا اس حال میں کہ وہ بہت ہی زیادہ بارش والا ہوگا۔ مدرارا بروزن مفعال (مونث و مذکر) یکساں ہے۔

(۱۲) وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ (ترجمہ:۔اور تمہاری مدد فرمائے گا اموال اور بیٹوں سے اور تمہارے لئے باغات اگائے گا) یعنی بساطین۔ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا (ترجمہ:۔اور تمہارے لئے نہریں بنائے گا) اس بارش سے اور یمددکم اور یجعل لکم پر جزم ہے۔ کہ وہ جواب امر ہے۔

(۱۳) مَالَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا (ترجمہ:۔کیا ہوا تمہیں کہ اللہ کی عظمت و وقار کو نہیں مانتے) رجاء کے دو معنی ہیں پہلے معنی ہیں خوف۔ ثعلب کہتے ہیں کہ فراء نے کہا ہے کہ رجاء کا لفظ خوف کے معنی میں نہیں آتا مگر جور کے ساتھ۔ آپ کہتے ہیں مارجوتک یعنی ماخفتک (میں نے تم سے نہیں ڈرا) آپ رجوتک کے لفظ کو خفتک کے معنی میں نہیں بولتے۔ اس طرح لایرجون ایام اللہ (الجاثیہ ۱۴) میں مفہوم ہے یعنی وہ اللہ کے ایام کا خوف نہیں کرتے۔ قطرب کہتا ہے کہ یہ حجاریہ لغت ہے۔ اور ھذیل، خزاعۃ اور مضر کہتے ہیں لم اُرجُ بمعنی لم ابال۔ فراء کہتے ہیں کہ بعض مفسرین نے آیت وترجون من اللہ مالا یرجون۔ (النساء ۱۰۴) کے معنی تخافون بتائے ہیں اور اس نے کہا ہے کہ ہم "رجا" کے معنی کو خوف کے معنی میں نہیں دیکھتے مگر اس حال میں کہ اس کے ساتھ حرف نفی لگا ہوا ہے۔ میں کہتا ہوں یہی مفہوم آیت "قال الذین لا یرجون لقاء نا" (یونس ۱۵) میں ہے یعنی لا یخشون لقاء نا۔ ابوعبیدہ نے بھی یہی ذکر کیا ہے۔ رجا کے دوسرے معنی وہ ہیں جو صاحب کشاف نے ذکر کئے ہیں۔ لا تاملون للہ توقیرا یعنی تعظیماً (یعنی کیا ہو گیا ہے تمہیں کہ اللہ کی توقیر یعنی عظمت میں غور و فکر نہیں کرتے۔) پہلے معنی زیادہ مناسب ہیں۔

(۱۴) وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا (ترجمہ:۔حالانکہ اس نے تمہیں کئی طور سے پیدا کیا) یہ جملہ حال کی جگہ پر ہے اطوار کے معنی ہیں مختلف احوال۔ ابن عباسؓ اور مجاہد نے فرمایا ہے کہ نطفہ سے (علقہ) جمے ہوئے خون سے اور گوشت کے لوتھڑے سے پیدا کیا اور یہ بھی کہا گیا ہے مختلف رنگوں میں پیدا کیا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بچے، جوان اور بوڑھے یہ ہے لوگوں کے اطوار کی تفسیر اور یہ بھی کہا گیا کہ اطوار سے مراد بیمار اور تندرست ہے۔ اور اسی طرح اس سے غنی اور فقیر بھی مراد ہے۔

(۱۵) اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ۔ (ترجمہ:۔کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کیسے سات آسمان پیدا کئے۔) عقلمند اور مکلّف افراد سے یہ خطاب ہے۔ اس آیت سے مراد ہے کہ عاقل شخص ان بڑے اقسام کی تخلیق سے اللہ کی قدرت کے کمال پر استدلال کرتا ہے۔ طِبَاقًا (ترجمہ:۔اوپر تلے) یعنی بعض، بعض کے اوپر ہیں یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یعنی ذات طباق۔ اور توحید کی دوسری دلیل ہے۔

(۱۶) **وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ** (ترجمہ:۔اوران میں بنایا چاندکو) قطرب کہتے ہیں کہ **فیھن** بمعنی **معھن** کے ہیں۔یعنی چانداورسورج کی تخلیق آسمانوں کی تخلیق کے ساتھ فرمائی۔علامہ ابن ہشام المغنی میں فرماتے ہیں **فی** کا لفظ مصاحبت کے معنی میں آتا ہے۔جیسے آیت **خرج علی قومه فی زینته** (القصص ۷۹) کا مطلب **مع زینة** ہے۔امام رازی اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ یہ اس طرح سے ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ **السلطان فی العراق** اس کا مطلب یہ نہیں سلطان کی ذات عراق کے ہرگوشہ میں رہتی ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عراق کے گوشوں میں سے کسی ایک گوشہ میں اس کی ذات ہے۔ یہاں بھی وہی مفہوم ہے اور بعض کہتے ہیں کہ آسمان شفاف اور لطیف اجرام ہیں اس وجہ سے آسمانِ دنیا والی چیز اس طرح نظر آتی ہے گویا کہ وہ اس کے اوپر ہو اور پھر وہ شئے پورے آسمان پر نظر آتی ہے۔یہی حال چاند کا بھی ہے۔ابن کیسان کا بھی یہی نظریہ ہے میں کہتا ہوں حق وہی ہے جو قطرب کا قول ہے۔ **نُوْرًا** (ترجمہ:۔روشن) مجازی طور پر منور کے معنی میں ہیں۔ **وَّجَعَلَ الشَّمْسَ** (ترجمہ:۔اور سورج کو بنایا) آسمان میں **سِرَاجًا** (ترجمہ:۔چراغ) یعنی زمین والوں کے لئے ''دیا'' کیونکہ وہ معاشی تصرفات میں اس کے محتاج ہیں۔اس بارے میں اختلاف ہے کہ یہ دونوں روشن اجرام جس طرح زمین والوں کے لئے روشن ہیں کیا اسی طرح آسمان والوں کے لئے بھی روشن ہیں۔ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ اہل زمین کے لئے روشن ہیں آسمانوں پر ان کی کوئی روشنی نہیں ہے۔اور ابن عمر نے کعب سے فرمایا تھا کہ کیا آپ نے اللہ کا یہ ارشاد نہیں سنا۔**وجعل القمر فیھن نوراً وجعل الشمس سراجاً** یعنی آسمانوں اور زمینوں میں ۔ **فیھن** کی ضمیر آسمانوں کی طرف لوٹ رہی ہے اس صورت میں معنی ہوں گے کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین میں منور فرمایا۔اور اسی طرح اس نے سورج کو چراغ بنایا۔اس قول کی تائید ابن عمرؓ کے ایک اور قول سے ہوتی ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ سورج اور چاند کے چہرے آسمانوں کی طرف ہیں۔اور ان کی پشت زمین کی طرف ہے۔اسی طرح سے ابن عباسؓ سے چاند کے بارے میں مروی ہے پھر جب ان کے چہرے آسمانوں کی طرف ہیں وہ کیونکر انہیں نہیں روشن کرتے ہوں گے۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ نے قمر کو نور اور شمس کو ضیاء بنایا۔نور وہ ہوتا ہے جس میں برق اور احراق (تپش وجلن) نہیں ہے اور ضیاء وہ ہے جس میں تپش وجلن ہوتی ہے اس اعتبار سے قمر، شمس سے افضل ہے۔ کیونکہ قمر نور کا منبع ہے اور شمس ضیاء کا مجموعہ ہے۔اسی واسطے سے اللہ نے اپنی ذات کی وصف نور کے ساتھ بیان فرمائی جیسے کہ فرمایا **الله نور السموات والارض** (النور ۳۵) یہ نہیں فرمایا کہ **ضیاء السموات والارض**۔اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعا میں فرمایا ہے۔ **اللھم اجعل فی قلبی نوراً** اور ضیاء نہیں فرمایا۔توحید کی تیسری دلیل

(۱۷) **وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا** (ترجمہ:۔اور اللہ نے تمہیں زمین سے ایک طرح کی روئیدگی کے ساتھ اگایا) یعنی اللہ نے تمہیں زمین سے نباتات کی طرح اگایا۔اور یہ اس لئے کہ آدمؑ کو زمین سے پیدا کیا۔اور معنی یہ ہیں کہ اللہ نے تمہیں زمین سے پیدا کیا پس روئیدگی کو انشاء کا استعارہ بنا دیا۔اور تم پہلے کچھ بھی نہیں تھے مگر مٹی۔فراء نے کہا النبات اسم ہے جو مصدر کا قائم مقام ہے جیسا کہ اللہ نے فرمایا۔**وانبتھا نباتا حسنا** (آل عمران ۳۷) (یعنی مریم کو) اور صاحب کشاف نے کہا اس کے معنی ہیں اللہ نے تم کو

مٹی سے پیدا کیا۔اور پھر اس نے تمہیں پروان چڑھایا عمدگی کے ساتھ اس اعتبار پر نباتا منصوب ہوگا فعل کے ساتھ جس پر انبتا کا لفظ دلالت کرتا ہے۔اور یہی تقدیر عبارت انبتها نباتا حسنا کی ہے۔ فنبتت نباتا حسنا۔تقدیر عبارت کی انتفاء اس کے وجود سے اولیٰ ہے۔میرے نزدیک صحیح بات وہ ہے جس کی طرف فراء کا میلان ہے اور امام رازی نے کہا یہ دوسرا قول یعنی صاحب کشاف کا اولی ہے۔ کیونکہ انبات اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور اللہ کی صفت ہمارے لئے غیر محسوس ہے۔پس ہم نہیں جانتے وہ اگانا مکمل طور پر عجیب قسم کا اگانا ہے۔مگر اللہ کے بتلانے سے۔اور یہ مقام اللہ کی قدرت کاملہ پر استدلال کا مقام ہے۔پس اس کا اثبات صرف سماعت سے ممکن نہیں ہے۔البتہ جب اس نے فرمایا کہ انبتکم نباتا تو یہ اس معنی میں ہے کہ انبتکم فنبتّم نباتا عجیبا کاملا۔تو یہ ارشاد نبات کے لئے وصف ہے اس اعتبار سے کہ وہ عجیب ہے کامل ہے اور نبات کا عجیب وکامل ہونا امر مشاہد ہے۔پس اس کے ذریعہ اللہ کی قدرت کے کمال پر استدلال ممکن ہے۔پس یہ اس مقام کے موافق ہے اس سے ظاہر ہوا کہ اس حقیقت سے اس مجاز کی طرف عدول کرنا اس لطیف راز کی وجہ سے تھا۔میں کہتا ہوں کہ ائمہ اہل سنت کا یہ نظریہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اشیاء کی ماھیات اور ان کے وجودات کا پیدا کرنے والا ہے۔انہوں نے یہ نہیں کہا کہ وہ فقط اشیاء کے وجودات کا پیدا کرنے والا ہے اس معنی میں کہ اللہ نے اشیاء کو موجود کرلیا ہو۔جیسا کہ مرکب تخلیق کا نظریہ رکھنے والوں کا عقیدہ ہے کیونکہ ان کے نزدیک پیدا کرنے والے نے ماھیات کو موجود کرلیا۔یعنی ماھیت کا وجود کے ساتھ متصف ہونا اس حیثیت سے کہ وہ مفہومیت سے غیر مستقل ہے۔پس ان کے نزدیک (جعل) کرنے کا اثر ماھیت کے وجود کے ساتھ متصف ہونے پر مترتب ہوتا نہ کہ نفس ماھیت پر۔پس ماھیت بالذات غیر مجعولۃ ہوگی اس تقدیر پر معنی ہوں گے کہ اللہ نے تمہیں صورت نباتیۃ پہنائی اور تم بہترین نبات ہوگئے اور اس وقت انشاء اور ایجاد کا اثر انسان کی حقیقت اور اسکی ماھیت پر مرتب نہیں ہوگا۔پس وہ نہ تو بالذات مجعولہ ہوگی نہ بالطبع۔جبکہ مقام توحید اس کا انکار کرتا ہے۔پس حقیقت کا اعتبار مجاز سے اولی ہے جب نباتاً کو انباناً کے معنی میں لیا جائے گا یا جیسا کہ فراء نے کہا کہ وہ نباتا کا اسم ہے تو یہ اشکال وارد نہیں ہوگا۔پھر معنی یہ ہوں گے کہ اللہ نے تمہیں پیدا کیا پیدا کرنا پھر اس وقت انشاء کا اثر انسان کی حقیقت اور اس کی ماھیت پر مرتب ہوگا اور یہی وہ جعل بسیط ہے اور یہی ہمارے علماء کے نزدیک حق ہے۔اور اسی طرف اللہ نے جعل الظلمات والنور کے ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے یعنی اس نے نور اور ظلمات کے نفس کو بنایا۔اس مقام پر یہی معنی مناسب ہیں اس لئے واجب ہے کہ اللہ نے یہاں پر توحید کے جتنے بھی دلائل فرمائے ہیں ان میں ان معنی کی رعایت رکھی جائے۔خلیل اور زجاج نے کہا یہ مصدر ہے اور معنی پر محمول ہے۔کیونکہ انبتکم کے معنی ہیں جعلکم تُنبِتُون نباتاً اور یہ معنی فراء کے نظریہ کے قریب ہیں۔

(۱۸) **ثُمَّ يُعِيدُكُمْ فِيهَا** (ترجمہ:۔ پھر تمہیں اس میں لوٹائے گا) یعنی زمین میں موت کے بعد **وَيُخْرِجُكُمْ** (ترجمہ:۔اور تمہیں نکالے گا) بعثت کے ذریعہ اس مٹی سے قیامت کے روز **اِخْرَاجًا** (ترجمہ:۔نکالنا) لازمی طور پر یہ حق ہے۔اور چوتھی دلیل ہے۔

(۱۹) **وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا** (ترجمہ:۔اور اللہ نے تمہارے لے زمین کو فرش بنایا) اس طرح کہ تم اس

پر لیٹتے سوتے ہیں جیسے ان بچھونوں پر جنہیں تم گھروں میں بچھاتے ہو۔اس آیت میں جار مجرور کو مقدم لایا گیا ہے تمہاری ذات کی طرف لوٹنے والے منافع کے اختصاص کو ظاہر کرنے کے لئے۔

(۲۰) **لِّتَسْلُكُوا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا** (ترجمہ:۔کہ اس کی کشادہ راہوں میں چلو پھرو) یعنی وسیع راستوں میں ۔ **فجاج** ' **فج** کا جمع ہے۔فراء کہتے ہیں کہ **فج** کے معنی ہیں کشادہ راستہ۔اور اسی سے ارشاد ربانی ہے۔ **من کل فج عمیق** (الحج ۲۷)اور حدیث میں آیا ہے۔ **کل فجاج مکه** مکہ کے تمام راستے قربان گاہ ہیں)**فجاج** کے معنی ہیں کشادہ راستے اسی سے حدیث پاک ہے کہ آپ نے عمر فاروقؓ سے فرمایا تھا کہ **ما سلکت فجاالا سلک الشیطن فجاغیرہ** (آپ جس راستے پر چلیں گے تو شیطان اس کو چھوڑ کر دوسرے پر چلے گا)

(۲۱) **قَالَ نُوحٌ** (ترجمہ:۔نوح نے عرض کیا) ان کے کفر کی شدت اور حق کی روگردانی دیکھنے کے بعد۔**رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِیْ** (ترجمہ:۔اے میرے رب بے شک انہوں ے میرا حکم نہیں مانا) یعنی میری نافرمانی پر مستقل مصر رہے اور میرا بلاوہ نہیں سنا۔باوجودیکہ میں نے موعظۃ حسنہ اور نرمی کے ساتھ ان کی ہدایت کے بارے میں حد درجہ کوشش کرلی۔**وَاتَّبَعُوا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗ اِلَّا خَسَارًا** (ترجمہ:۔اور انہوں نے ان کی پیروی کی جن کو ان کے مال واولاد نے نقصان کے سوا کچھ نہیں بڑھایا) یعنی اپنے رئیسوں اور مالداروں کی تابعداری یہ وہ ہیں جنہیں کثرت مال اور کثرت اولاد کفر و گمراہی کے علاوہ کچھ اضافہ نہیں کرتی۔امام رازی فرماتے ہیں کہ ان لوگوں نے اپنے گناہوں کے ساتھ ایک اور معصیت کو ملالیا تھا اور وہ تھی ان کے رئیسوں کی اطاعت جو انہیں کفر و گمراہی کی طرف بلاتے تھے۔اور **اِلَّا خَسَارًا** کے معنی ہیں کہ دنیا کی مالداری اور اس کے منافع اللہ اور اس کے رسول کے بغیر آخرت میں خسارہ کو ہی بڑھاتے ہیں۔ابن زبیر،حسن،نخعی،اخوان،ابن کثیر،ابوعمرو اور نافع نے خارجۃ کی روایت کے مطابق **وُلدہ** کو واؤ کے پیش اور لام کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ابوجعفر،شیبہ،نافع،عاصم اور ابن عمر نے اس کو زبر کے ساتھ پڑھا ہے اور دونوں لغتیں ہیں جیسے کہ **بُخل** اور **بَخل** اور ابوحاتم کہتے ہیں کہ اگر اسے **ولد** کی جمع بنایا جائے تو واؤ کے پیش اور لام کے سکون میں پڑھنا ممکن ہے۔

(۲۲) **وَمَكَرُوْا** (ترجمہ:۔اور انہوں نے مکر کیا) یعنی ان روساء اور بڑے لوگوں نے **مَكْرًا كُبَّارًا** (ترجمہ:۔بہت بڑا مکر) مبرد نے کہا کہ **کبّار** تشدید کے ساتھ مبالغہ کے لئے ہے۔عیسیٰ بن عمرو نے کہا کہ یہ یمنی لغت ہے۔ابن زید نے کہا ہے کہ عرب کہتے ہیں **امر عجیبٌ وعجابٌ** تخفیف کے ساتھ اور ج پر تشدید کے ساتھ بھی۔اس طرح **رجل حسان** اور **حُسان** بھی کہا جاتا ہے۔عیسیٰ اور ابن محیصن اور ابوشال نے اسے "با" کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور زید بن علی نے کاف کی زیر اور با کی زبر کے ساتھ پڑھا ہے۔ابن الانباری کہتا ہے کہ یہ کبیر کی جمع ہے۔یہاں پر گویا کہ لفظ **مکر** کو لفظ **ذنوب** کی جگہ استعمال کیا گیا۔

(۲۳) **وَقَالُوْا** (ترجمہ:۔اور انہوں نے کہا) اور کہنے والے ان کے بڑے لوگ تھے۔**لَا تَذَرُنَّ** (ترجمہ:۔ہرگز نہ چھوڑنا) یعنی عبادت نہ ترک کرنا۔ **اٰلِهَتَكُمْ** (ترجمہ:۔اپنے معبودوں کو) اور یہ وہ بت تھے جن کی وہ پوجا کرتے تھے **وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا**

سُوَاعًا وَّلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا (ترجمہ:۔ ہرگز نہ چھوڑنا ودا اور سواع' اور یغوث و یعوق اور نسر) کو ان ناموں کے مسمیات میں اختلاف ہے۔کعب کہتے ہیں کہ یہ نیک لوگوں کے نام ہیں۔ جو آدمؑ اور نوحؑ کے درمیانی عرصے میں تھے۔اور عروہ بن زبیر کہتے ہیں یہ آدمؑ کی اولاد کے نام تھے۔ و دان میں بڑا تھا اور یہ عابد و زاہد لوگ تھے جب وہ مر گئے تھے تو ان کے پیچھے والے ان کی موت پر بہت زیادہ محزون ملول ہوئے کسی نے ان میں سے کہا کہ میں تمہیں ان کی تصویریں بنا کر دیتا ہوں۔ پس اس نے ان مرنے والوں کی پیتل اور سیسے کی مورتیاں بنا دیں اور انہوں نے ان مورتیوں کو اپنی عبادت گاہوں میں رکھ لیا اور یہ سب کچھ محض ان کے صالح افعال کو یاد رکھنے کے لئے تھا۔ یہ ہے وہ جس نے ان مورتیوں کو جنم دیا پھر بعد میں لوگ آئے جو ان کی تعظیم و تکریم کرنے لگے یہاں تک کہ ان کی عبادت کی جانے لگی۔کہا گیا ہے کہ بعد میں یہ بعینہ مورتیاں قبائل عرب کی طرف منتقل ہو گئیں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ان بتوں کے صرف نام قبائل عرب میں پہونچے۔ پس وُدّ ''دومتہ الجندل'' میں کلب قبیلہ والوں کے لئے تھا اور سواع ھزیل کے لئے۔اور یہ بھی کہا گیا کہ وہ ہمدان کے لئے تھا۔اور یغوث' مراد قبیلے کے لئے تھا۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ مذحج کے لئے تھا۔اور یعوق ہمدان کے لئے تھا اور ایک قول یہ بھی ہے وہ مراد کے لئے تھا۔اور نسر' حمیر قبیلے کے لئے تھا۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ حمیر کے شاخ ذی الکلاع کے لئے تھا۔اسی وجہ سے عرب عبدود' عبد یغوث وغیرہ نام رکھتے تھے۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ودّ' مرد کی صورت پر تھا اور سواع عورت کی صورت پر۔اور یغوث شیر کی صورت پر اور یعوق گھوڑے کی صورت پر تھا اور نسر باز کی صورت پر' اور یہ بات پہلے بیان کردہ بات کے منافی ہے کہ انہوں نے نیک لوگوں کی صورتیں بنائیں۔اسے ابوحیان اور امام رازی وغیرہ نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔صحیح یہ ہے کہ یہ بت عرب کے پاس نہیں تھے۔کیونکہ نوحؑ کا علاقہ و اطراف طوفان میں برباد ہو چکا تھا۔اور وہ بت وغیرہ بھی باقی نہیں رہے لہذا قبائل عرب کی طرف منتقل نہیں ہوئے بلکہ قبائل عرب ان کے صرف نام سنتے رہتے تھے اور ان کی تعظیم کرتے تھے۔اور انہوں نے مورتیاں بنا ڈالیں۔جیسے انہوں نے چاہا اور ان مورتیوں کو اپنے عبادت خانوں میں رکھ لیا۔خاص طور پر بیت اللہ کے اندر طهره الله عن هذه الادناس۔ثعلبی کہتا ہے کہ یغوث' قبیلہ سبا کے ادھیڑ عمروں کے لئے تھا وہی اس کے وارث تھے یہاں تک کہ وہ ہمدان میں پہنچا۔اور اسی بارے میں مالک بن غیث ہمدانی کا شعر بھی ہے۔

یریش الله فی الدنیا و یبری ولا یبری یغوث ولا یریش

نافع اور ابوجعفر نے ودّ کو واؤ کے پیش کے ساتھ پڑھا ہے۔جبکہ حسن' اعمش اور طلحہ باقی قراء سبع نے زبر کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور جمہور نے و لا یغوث و یعوق کو بغیر تنوین کے پڑھا ہے۔اگر یہ عربی لفظ ہیں تو علم اور وزن فعل کی وجہ سے مانع صرف ہیں لہذا عجمی لفظ میں اور عجمہ اور علم کی وجہ سے مانع صرف ہیں اور اشهب نے فعولا کے وزن پر و لا یغوثا و یعوقاً پڑھا ہے۔پھر انہیں منصرفہ بنایا ہے۔البتہ جمہور کے نزدیک یہ غوث اور عوق سے صفات ہیں اور پھر وہ علمیت کی طرف منتقل ہوئے ہیں۔ابوحیان نے کہا یہ سارا خبط ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ مفعول کے وزن پر ہونا ممکن نہیں ہے۔اس لئے کہ ان کا مادہ مفقود ہے۔اور یہ غوث اور عوق سے صفت میں نہیں ہے۔کیونکہ

بروزن یفعل اسم اور صفت نہیں آتا۔ اور اسی وجہ سے منع صرف ہیں۔ اور ابن عطیہ کہتا ہے کہ اعمش نے ولا یغوثا ویعوقا کو مصرف پڑھا ہے۔ اور یہ وہم ہے۔ کیونکہ تعریف اور وزن فعل لازم ہے۔ ابوحیان کہتا ہے یہ وہم نہیں ہے کہ اس میں صرف اعمش ہی منفرد نہیں بلکہ اشہب عقیلی نے بھی اس پر اس کی موافقت کی ہے۔ نیز اس نے اس کی دو وجوہات میں سے کسی ایک وجہ پر تخریج میں بھی موافقت کی ہے۔ ایک یہ کہ وہ ایسی لغت پر لایا ہے جس میں عام عربوں کے نزدیک لا منصرف کو منصرف مانا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک لغت ہے جسے کسائی وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تنوین والے الفاظ جو اس سے پہلے اور اس کے بعد میں ہیں ان کی مناسبت سے اسے منصرف لایا گیا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے ودّا ولا سواعاً کا لفظ ہے اور اس کے بعد میں نسراً کا لفظ ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسا کہ سلاسل' قواریرا کو منصرت بنانے میں کہا گیا ہے۔ اور یہ محض مناسبت کی وجہ سے ہے۔ علامہ زمخشری فرماتے ہیں کہ یہ قراۃ مشکل ہے کیونکہ اگر یہ دونوں عربی یا عجمی لفظ ہیں تو دونوں میں منع صرف ہے۔ اور غالباً اس نے ازدواج کا ارادہ کیا ہے پھر وہ ان دونوں کو منصرف لایا ہے تاکہ ان دونوں کے اخواۃ جو کہ منصرف ہیں ودّا' سواعا اور نسراً صادق آئیں جیسا کہ وضُحٰھا کو امالہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اس لئے کہ وہ واقع ہوا ہے۔ ایسے الفاظ کے ساتھ جو امالے والے ہیں تاکہ ان کے ساتھ اس کا جوڑا بن جائے۔ ابوحیان کہتا ہے کہ زمخشری کو یہ پتہ نہیں چلا کہ یہاں پر بعض عرب کی لغت ہے۔ وہ یہ کہ عام لوگوں کے نزدیک منصرف نہ ہونے والا بھی منصرف ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے زمخشری کو یہ قراۃ مشکل نظر آتی ہے۔

(۲۴) **وَقَدۡ اَضَلُّوۡا کَثِیۡرًا** (ترجمہ:۔ اور انہوں نے اکثر لوگوں کو گمراہ کردیا) یہ نوحؑ کا مقولہ ہے معنی یہ ہے کہ ان کے رئیسوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے اور یہ حضرت ابراہیم کے اس قول کی طرح ہے کہ رب انھن اضللن کثیراً من الناس ۔(ابراہیم ۳۶) **وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِیۡنَ اِلَّا ضَلٰلًا** (ترجمہ:۔ اور ظالموں کے لئے زیادہ نہ کر مگر گمراہی) کہا گیا ہے کہ ضلال کے معنی عذاب کے ہیں جیسا کہ آیت ان المجرمین فی ضلال وسعر (القمر ۴۷) میں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ضلال کے معنی ہیں خسران۔ اور یہ بھی قول ہے کہ اس کے معنی ہیں مال اور اولاد کے ذریعہ فتنہ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں ضیاع۔ میں کہتا ہوں کہ جب حقیقی معنی مراد لینا درست ہوں تو وہاں پر مجازی معنی مراد نہیں لینا چاہئے۔

(۲۵) **مِمَّا خَطِیۡٓئٰتِہِمۡ** (ترجمہ:۔ ان کے گناہوں کی وجہ سے) یہاں 'ما' زائد ہے تاکید کے لئے۔ جمہور اور قراء سبع نے اسی طرح پڑھا ہے۔ اور خطایا ھم بھی پڑھا گیا ہے۔ معنی ہے کہ یہ کفار اپنی خطاؤں کی وجہ سے **اُغۡرِقُوۡا** (ترجمہ:۔ غرق کردئے گئے) طوفان کے ذریعہ۔ **فَاُدۡخِلُوۡا نَارًا** (ترجمہ:۔ پھر آگ میں داخل کردئے گئے) یعنی غرق کردئے گئے) یعنی غرق کرنے کے بعد **فَلَمۡ یَجِدُوۡا لَہُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَنۡصَارًا** (ترجمہ:۔ تو انہوں نے اللہ کے مقابل کسی کو اپنے لئے مددگار نہیں پایا) یعنی وہ ایسا کوئی شخص نہیں پائیں گے جو ان کی مدد کرے اور قیامت کے دن ان کو اللہ کے عذاب سے بچا سکے۔

(۲۶) **وَقَالَ نُوۡحٌ رَّبِّ لَا تَذَرۡ** (ترجمہ:۔ اور نوح نے کہا میرے رب مت چھوڑ) کسی بھی ایک کو **عَلَی الۡاَرۡضِ**

مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (ترجمہ:۔ زمین پر کافروں میں سے کسی کو) جو اللہ اور اس کے رسول سے دشمنی وعداوت رکھتے ہیں۔ دَيَّارًا (ترجمہ:۔ بسنے والا) قتادہ فرماتے ہیں کہ نوحؑ نے ان کے خلاف دعا اس کے بعد مانگی تھی جب ان کی طرف وحی کی گئی تھی کہ تمہاری قوم میں اب کوئی ایمان لانے والا نہیں۔ تو اللہ نے آپ کی دعا کو قبول فرمایا۔ اور انہیں غرق فرمادیا۔ ابن زید وعطیہ کہتے ہیں کہ آپ نے اس وقت دعا کی تھی جب اللہ نے تمام مومنین مرد وعورتوں کو ان کے والدین کے اصلاب وارحام سے نکال لیا تھا۔ اور اب ان کے اصلاب وارحام بانجھ ہو چکے تھے۔ علی الارض کے قول سے مراد نوحؑ کا علاقہ ہے کیونکہ اپنے علاقے والوں کی طرف مبعوث تھے اس صورت میں الارض پر ''ال'' عہد خارجی کا ہے۔ اور اس زمین سے مراد وہی ہے جو ارارات کے پہاڑ کے پاس سمندروں کے درمیان واقع ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کا ایک حصہ جودی بھی ہے۔ اس میں بہت بڑے سیلاب' بھری ہوئی نہریں جاری ہوگئیں اور وہ محض پانی کی اس کثرت کی وجہ سے تھا جو ان سمندروں سے بہنے لگا پس کافرین سے مراد وہی لوگ ہیں جو اس زمین والے تھے اور ایمان سے باز آ گئے تھے۔ پس کافرین پر ''ال'' بھی عہد داخلی کا ہے۔ اور یہ لوگ آپ کی قوم تھے نوحؑ ان کی ہدایت کے لئے ان کے درمیان بھیجے گئے اور متعدد آیات میں اللہ نے ارشاد فرمایا ہے جیسا کہ سورۃ المومنین میں ارشاد فرمایا ہے **ولقد ارسلنا نوحاً الی قومه فقال یا قوم اعبدوا الله مالكم من اله غیره افلا تتقون**۔ (المومنون۲۳) اور سورۃ الانبیاء میں فرمایا ہے **ونوحا اذ نادی من قبل فاستجبنا له فنجیناه واهله ومن الكرب العظیم. ونصرناه من القوم الذین كذبوا بآیاتناانهم كانوا قوم سوء فاغرقناهم اجمعین**۔ (الانبیاء۷۶،۷۷) اور اسی طرح اس سورۃ کے آغاز میں فرمایا گیا ہے **انا ارسلنا نوحا الی قومه ان انذر قومک ومن قبل ان یاتیهم عذاب الیم**۔ یہ آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اس زمین والے وہی لوگ تھے جو غرق کردئے گئے سوائے ان کے جو آپ کی اولاد میں سے بچ گئے۔ اور اگر پوری زمین مراد لی جائے اور کافرین سے مراد روئے زمین میں سے تمام کفار بنی آدم مراد لئے جائیں تو آپ کا تمام لوگوں کی طرف رسول ہونا لازم آئے گا جو غیر صحیح ہے۔ اور اس کی بھی دو وجوہ ہیں پہلی وجہ یہ ہے کہ تمام لوگوں کی طرف آپ کی بعثت نصوص قطعیہ کے خلاف ہے جن کا ابھی ہم نے ذکر بھی کیا۔ کیونکہ ان کا مفاد یہ ہے کہ آپ کو اللہ نے صرف آپ ہی کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ تمام لوگوں کی طرف رسول ہونا یہ سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے جیسا کہ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ **وما ارسلناک الا كافة للناس**۔ (سبا۲۸) اس لئے الارض اور الکافرین پر داخل ''ال'' سے الف لام کا استغراق مراد لینا صحیح نہیں ہے۔ اور طوفان کا سبب وہی ہے جو ارشاد فرمایا گیا **وقیل یاارض ابلعی ماءک ویا سماء اقلعی**۔ (ہود۴۴) اور یہ اصل ہے۔ کیونکہ ہر شئے کا وقوع اہل حق کے نزدیک موقوف ہے۔ اس کی مشیت پر اور اس کا ظاہری سبب چالیس دن تک انتہائی کثیر بارش کا برسنا اور بہت ہی زیادہ چشموں کا پھوٹ پڑنا اور بہت ہی زیادہ فواروں کا پھوٹ پڑنا جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے **ففتحنا ابواب السماء بماء منهمر. وفجرنا الارض عیونافالتقی الماء علی امرقد قدر**۔ (القمر۱۲) اور سورۃ المومنون میں فرمایا **فاذا جاء امرنا وفار التنور**۔ (المومنون۲۷) اور تنور پانی کا منبع ہوتا ہے۔ اسی طرح صاحب اللسان نے لکھا

ہے۔صاحب قاموس کے مطابق ہر پانی کے نکلنے کی جگہ کو تنور کہتے ہیں۔منجم کہتے ہیں کہ کواکب کا برج سرطان میں داخل ہونا پانی کے طوفان کا بہت اہم سبب ہے اور زمانہ نوحؑ میں کواکب سبعہ سیارہ اس برج میں داخل ہو گئے تھے اس لئے طوفان واقع ہوا تھا اور ان دونوں میں اس برج کا طلوع نوحؑ کے علاقہ میں تھا جس کی وجہ سے وہ لوگ غرق ہو گئے۔یہ ان لوگوں کا قول ہے جو اس طوفان کے خارجی اثرات میں غور وفکر کرتے ہیں۔البتہ اس کا اصل سبب وہی ہے جو اللہ نے ذکر فرمایا۔مبرد کہتا ہے کہ دیّار کا لفظ عام نفی میں استعمال ہوتا ہے۔مثلاً بالدار دیار۔یہ اثبات میں استعمال نہیں ہوتا۔قتیبی نے بھی یہی کہا ہے۔فراء اور زجاج کہتے ہیں کہ یہ دور سے فیعال کے وزن پر ہے اور اصل اس کا دیوار ہے۔کہتے ہیں کہ جب یائے ساکنہ کے بعد واؤ واقع ہو اور اس سے پہلے زبر ہو تو اس واؤ کو یائے سے تبدیل کر دیا جاتا ہے اور ادغام کر دیا جاتا ہے مثلاً ایّام اور قیام۔اور وہ جو حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ **فی کل دور الانصار خیر** اس سے بھی مراد جگہ یا مکان ہے۔اور اسی طرح آپ کا ارشاد ہے کہ **وھل ترک لنا عقیل من دار** اس سے بھی مراد جگہ یا مکان ہے اور اسی طرح اللہ کا فرمان ہے۔ **ولنعم دار المتقین**۔(النحل ۳۰) دار منزل اور رہائش کی جگہ کے لئے استعمال ہوا ہے۔مقصد یہ ہے کہ دار کا استعمال اثبات کی جگہ پر مجاز ہے اور مقام نفی اس کا استعمال حقیقی معنوں پر ہوتا ہے۔الدارۃ خاص ہے دار سے۔جیسا کہ ابو ہریرۃؓ کے قول میں ہے **یالیلۃ من طولھا وعناء ھاء علی انھا من دارۃ الکفر بخت**۔کیونکہ یہاں ''دارۃ'' کا لفظ بھی ''بلد'' استعمال ہوا ہے اور اسی سے دارالرسول اور اسی سے ہے **والذین تبوّو الدار والایمان**۔(الحشر ۹) یہاں دار سے مراد مدینہ ہے۔

(۲۷) **اِنَّكَ اِنۡ تَذَرۡهُمۡ** (ترجمہ:۔بے شک تو نے انہیں چھوڑا) یعنی زندہ **يُضِلُّوۡا عِبَادَكَ** (ترجمہ:۔تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کر دیں گے) لوگوں کی نظروں میں باطل امور کو مزین کر کے اور مکر وفریب کے ذریعہ۔ **وَلَا يَلِدُوۡۤا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا** (ترجمہ:۔ان کی اولاد نہ ہوگی مگر بدکار شدید کافر) یعنی جنم دیں گے۔ایسے افراد کو جو بدکاری اور کفر کریں گے کیونکہ وہ نوحؑ کے علم میں کافر ہی ہیں۔کفار اور کفور دونوں میں مذکر اور مونث یکساں ہیں۔

(۲۸) **رَبِّ اغۡفِرۡلِىۡ وَلِوَالِدَىَّ** (ترجمہ:۔اے میرے رب مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو) اور وہ دونوں مومن تھے آپ کے والد کا نام لمک بن متوشلخ اور آپ کی والدہ کا نام شمخاء بنت انوش ہے۔عطاء سے مروی ہے کہ آدمؑ اور نوحؑ کے درمیان کوئی کافر نہ تھا اور اسے لولدی یعنی سام اور حام پڑھا گیا ہے۔ **وَلِمَنۡ دَخَلَ بَيۡتِىَ** (ترجمہ:۔اور اسے جو میرے گھر میں داخل ہوا) اور نیز اس سے مراد کشتی ہے **مُؤۡمِنًا** (ترجمہ:۔ایمان لاکر) یہ دخل کے ضمیر سے حال ہے۔ **وَّلِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيۡنَ اِلَّا تَبَارًا** (ترجمہ:۔ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو اور ظالموں کے لئے زیادہ نہ کر مگر ہلاکت) ہلاک کرکے (تبارا معنی ہیں ہلاکت) زجاج کہتے ہیں ہر ٹوٹی ہوئی چیز کو تبراً کہتے ہیں۔